OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

فکرِ اقبال پر بیدل، غالب اور سر سید کے اثرات: ایک تحقیقی مطالعہ

A Study of Effects of Baidel, Ghalib and Sir Syed on Iqbal's Thought

Dr. Muhammad Amir Iqbal
Assistant Professor, Urdu Department, University of Sialkot
Maria Bilal
Lecturer, Urdu Department, University of Sialkot
Rashida Malik
Doctoral Candidate, GCWU, Sialkot

Abstract

Kalam-i-Iqbal is not less than Jam-i-Jahan-nama. It has thousands of figures of letters and sounds. Their study takes the reader into a world of understanding where the limits of perception expand. There are many forms of figure carving in the intellectual and artistic world of Danai-e-Raz. If we mention personal situations, the figures of Mirza Baidal, Ghalib and Sir Syed will appear. Mirza Baidal's conscious and thought-filled points influenced Iqbal's mind. Iqbal always kept his thoughts burning with the candle of Ghalib's closeness. The thought of Sir Syed played the role of the most important source for the expansion of Iqbal's thoughts, ideas and objectives. Studying this article will provide an extension to the topics of Iqbal Studies. Its study will create openness in the topics for criticism. The sources of this article will inspire the study of international works to broaden the scope of Iqbal Studies.

Keywords: Understanding, Perception, Influenced, Burning, Expansion, Criticism

CC BY

تمہید

مرزا عبدالقادر بیدل 1644ء میں پیدا ہوئے اور دسمبر 1720ء میں وفات پائی۔ آپ کا شمار ہندوستان کے معروف ترین فارسی شعرا میں ہوتا ہے۔ اقبال نے چار افراد کی عظمت و برتری کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ محی الدین ابنِ عربی، شنکر اچاریہ، مرزا بیدل اور ہیگل کے سحر میں جو شخص بھی گرفتار ہوا پھر وہ رہائی نہ پاسکا۔ یہ بیدل کی شاعرانہ سحر خیزی تھی جو قاری کو اپنے حصار میں جکڑ لیتی تھی۔ نجم الدولہ، دبیر الملک، مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب بہادر نظام جنگ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور 1869 میں دہلی میں وفات پائی۔ غالب کا دعویٰ تھا کہ ان کے خیال میں غیب سے مضامین وارد ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے وقت قلم سے جاری ہونے والی آواز کو نوائے سروش قرار دیتے تھے۔ انیسویں صدی کو غالب سے منسوب کیا جاتا ہے جبکہ اٹھارویں صدی کو میر تقی میر سے۔ بیسویں صدی فکرِ اقبال کی تفسیر و تعبیر کی صدی ہے۔ غالب کی عظمت کا راز صرف ان کی شاعری کے حسن اور بیان کی خوبی ہی میں نہیں بلکہ ان کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات کو گہرائی میں جا کر سمجھتے تھے اور بڑی سادگی سے عام لوگوں کے لیے بیان کر دیتے تھے۔ غالب جس پُر آشوب دور میں پیدا ہوئے اس میں انھوں نے مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت کو برباد ہوتے ہوئے اور باہر سے آئی ہوئی انگریز قوم کو ملک کے اقتدار پر چھاتے ہوئے دیکھا۔ یہی وہ پس منظر ہے جس نے غالب کی نظر میں گہرائی اور فکر میں وسعت پیدا کی۔ احمد خان متقی بن محمد متقی 1817ء میں پیدا ہوئے اور 1898ء میں وفات پائی۔ آپ نے سرسید کے لقب سے شہرت پائی اور اپنی صلاحیتوں کی بدولت حیاتِ جاوید پا گئے۔ آپ کے تعلیمی افکار نے مسلمانوں میں حصولِ علم کی روح پھونکی اور مسلمان جدید علوم سے روشناس ہوئے۔ آپ نے مذہب اور سائنس کے نئے پہلوؤں کی نشاندہی فرمائی۔ آپ نے مصلحِ قوم بن کر رہنمائی فرمائی اور مسلمانوں کو جدید علوم کے مطالعے کا خوگر بنا دیا۔ اقبال نے ان شخصیات کا اثر قبول کیا اور اپنے فکر و فلسفہ کو ان کے افکار و نظریات کے علاوہ ان کے فکر و فن سے بھی متاثر دکھائی دیے۔ کلامِ اقبال کا تحقیقی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان ماہرین کی تاثیر نے اقبال کے قلب و ذہن پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ اقبال نے ان ماہرین کی اہمیت و قابلیت کا بھرپور اعتراف بھی کیا ہے جس کی مثالیں فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں میں پوشیدہ ہیں۔ اقبال کی بیدل شناسی، اقبال کی غالب فہمی، اقبال اور غالب کے ذہنی رشتے اور سرسید مصدرِ اقبال کی روشنی میں فکرِ اقبال کا مطالعہ نئے تحقیدی زاویے استوار کرتا دکھائی دیتا ہے۔

مرزا عبدالقادر بیدل

مرزا عبدالقادر بیدل فارسی کے بہت عمدہ شاعر تھے۔ اقبال خاص طور پر ان کی شاعری سے متاثر تھے۔ بیدل کی شاعری میں جو فلسفیانہ اثر ہے اس کا کچھ رنگ غالب میں بھی پایا جاتا ہے اور اقبال کی شاعری میں تو دونوں کا ہی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے۔

> ”دنیا میں چار اشخاص ایسے ہیں۔ کہ جو بھی ان کے طلسم میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ مشکل سے رہائی پاتا ہے۔ اور وہ چاروں ہیں۔ محی الدین ابن عربی، شنکر اچاریہ بیدل اور ہیگل“[1]

بہت سے اقبال شناس بھی یہی دعویٰ کرتے دکھائی دیتے ہیں اور انہوں نے بھی اپنے تاثرات میں اس بات کی تائید کی ہے۔ بیدل اگرچہ فارسی زبان کے شاعر تھے مگر اردو ادب میں شاعری پروان چڑھی ہی فارسی کے باعث۔ غالب اور اقبال نے بھی فارسی زبان سے شاعری کو دلکش بنایا۔ اقبال نے فارسی زبان سے جو کچھ حاصل کیا اس کے استعمال میں بھی انفرادیت کا رنگ اختیار کیا۔ اقبال کا دعویٰ تھا کہ پیر رومی نے میری خاک کو اکسیر بنا دیا اور میری خاک سے کئی جلوئے تعمیر کر دیے۔

؎ پیر رومی خاک ما اکسیر کرد

از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد[2]

اقبال مولانا روم کو اپنا روحانی پیشوا قرار دیتے تھے۔ اسی لیے افلاک کی سیر میں اپنے پیر و مرشد کی قیادت میں چلے۔ اس طرح رومی شناسی کی نئی روایات نے جنم لیا اور اسے مضبوط بنیادیں میسر آئیں۔ پروفیسر عبد الحق نے اپنے ایک مضمون میں ملا محمد حسین نظیری نیشاپوری المعروف نظیری کے مطالعے کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ مولانا گرامی کے حوالہ سے پروفیسر عبد الحق لکھتے ہیں:

"ملا نظیری نے اقبال کو ہی اپنا جانشین منتخب کیا ہے"[3]

اقبال نے جگہ جگہ بیدل کا حوالہ دیا ہے۔ اقبال کی ڈائری "بکھرے خیالات" سے بھی بیدل کے حوالے سامنے آتے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہے کہ اقبال صرف بیدل کی فارسی دانی ہی سے نہیں بلکہ بیدل کے فلسفہ اور شاعری سے بھی متاثر تھے۔ اقبال کے خطوط کے حوالے بھی بیدل کی عظمت کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کی نظر میں بیدل عمدہ مقام کے حامل تھے۔ ایسے اشارے بھی نظر سے گزرتے ہیں کہ اقبال بیدل کے شعر سے متاثر ہوئے۔ بیدل کا شعر تضمین کے طور پر استعمال کیا اور اس سے پہلے شعر میں بیدل کو مرشد کامل قرار دے دیا۔ "بانگ درا" کی نظم "مذہب" "تضمین بر شعر مرزا بیدل کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ "ضرب کلیم" جسے اقبال نے عصر حاضر کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا تھا۔ اس کی نظم "مرزا بیدل" حوالے کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہے۔ اس نظم کا آخری شعر مرزا بیدل کا ہے۔ اس طرح واضح ہے کہ اقبال فکر بیدل سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اقبال کسی عام آدمی کے فکر و فلسفہ سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ اگر بیدل سے متاثر ہوئے ہیں تو یہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ بیدل کی شاعری میں فکر و فلسفہ پایا جاتا ہے اور اس میں پائے جانے والے موضوعات پورے مشرقی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ عربی اور فارسی نے ہندوستان کو زبان کی حد تک ہی نہیں بلکہ ادبیات کو بھی شدید متاثر کیا۔ اردو زبان کے اثرات جو قلی قطب شاہ سے شروع ہو کر فیض احمد فیض تک پھیلے ہوئے ہیں ان کی تو مثال ہی نہیں ملتی۔ اقبال نے بھی اپنے شعر و نثر کی ترویج کے لیے اردو زبان کو آلۂ کار بنایا۔ اقبال کی تحریریں ہوں یا اشعار ان میں بیدل کا ذکر ضرور نظر آتا ہے۔ مرزا بیدل کے تذکرے کے بغیر اقبال کی فکر پروان ہی نہیں چڑھتی۔ اقبال مرزا بیدل کی عمیق سوچ ہی نہیں بلکہ بیدل کے صوفیانہ فکر کے بھی معترف تھے۔ آپ ایک غیر معمولی شاعر تھے۔ آپ کے انداز و اسالیب کی پیروی بہت مشکل بلکہ ناکام بات ہے۔ اقبال نے افکار بیدل کی تعبیر کی کوشش بھی کی تھی۔ انگریزی میں چند خیالات قلم بند کیے بھی تھے مگر کام مکمل نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے بعد میں اردو ترجمے کے ساتھ کام مکمل کیا اور شائع کرایا۔ یہ کام اگرچہ بہت مختصر ہے مگر اقبال شناسی میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ غالب جیسا فنکار بھی طرز بیدل کی تقلید کو یہ سمجھتا تھا کہ یہ تو قیامت کی سی آزمائش سے کم نہیں ہے۔ اقبال کو اپنے فلسفیانہ اظہار کے لیے جن شعری اسالیب کی ضرورت تھی، وہ راہیں بیدل کی طرف جاتی تھیں۔ اقبال کو کلامِ بیدل سے خاص قسم کی قربت بھی ہے۔ بیسویں صدی میں اقبال ہی ہے جس نے برصغیر میں رومی شناسی کے ساتھ بیدل شناسی کو پروان چڑھایا۔ یہ بات مکمل طور پر درست نہ بھی ہو مگر یہ ضرور ہے کہ اقبال ان اہم افراد میں ضرور شمار ہوں گے جنھوں نے بیدل شناسی کی ترغیب دی اور مواد فراہم کیا۔ جو فلسفیانہ مباحث یا موشگافیاں کلامِ بیدل میں پائی جاتی ہیں اور اقبال نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے اقبال کے کلام پر اس کے اثرات کئی رنگوں سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اشیائے کائنات کی پہچان اور حقیقت اولیٰ کے عرفان میں کلامِ بیدل کی فکر سے رجوع کرنے کی ضرورت پر اقبال کے تاثرات بڑے ہی معنی آفریں ہیں۔

بیدل نے وحدت کے مضمون کو شعری تلازموں کے ساتھ ان گنت روپ دیے ہیں اور اقبال کی ابتدائی فکر اسی وجودی تفکیر کے تابع ہے جس میں وحدت میں کثرت کا راز مخفی ہونے کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ فکر میں انحراف کا پہلو بھی سامنے آیا مگر

اقبال بیدل کی محبت سے کنارہ کش نہ ہو سکے اور بیدل کے فکری اور فلسفیانہ رتبے سے انکار نہ کیا۔ اگرچہ بیدل تصوف کے میدان میں بھی قدم رکھتے تھے۔ کئی سلسلوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اور عقیدت کی نگاہ سے بھی دیکھے جاتے تھے۔ مگر مفکرین کہتے ہیں۔

"وہ مروجہ تصوف اور مریضانہ مجاوری کو ناپسند کرتے تھے"[4]

جس طرح کے تصوف سے بیدل نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا ویسا ہی ناپسندیدگی کا اظہار اقبال نے بھی کیا ہے۔ اس حوالہ سے کلام اقبال سے مستند مثالیں اقبالیاتی ادب میں محفوظ بھی ہیں۔ اقبال کے فکر میں متضاد اور مترادف لازمی عناصر پائے جاتے ہیں۔ اقبال خود بھی اپنے لیے ان عناصر سے استفادہ کرنا لازم سمجھتے تھے۔ بیدل والے معاملے میں چاہے تصوف کے حوالے سے متضاد پہلو ہی سہی مگر مترادف پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔ یہی اقبال کی بیدل شناسی ہے اور ماہرین نے دلائل دے کر حوالہ جات کے ذریعے اقبال اور بیدل کے فکری رویوں میں مماثلت پیش کی ہے۔

اسد اللہ خان غالب

غالب نے اپنی شاعری میں فلسفہ کو فروغ دیا اور اقبال نے اسی روایت کو آگے بڑھایا۔ غالب پر غیب سے مضامین نازل ہوتے تھے۔ تو اقبال پر بھی ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی۔ دونوں نے خود کو خاص انداز سے پیش کیا ہے اور اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ کہنا بالکل درست ہو گا کہ:

"دونوں نے زمان و مکان کے فصیل کو مسخر کر لیا ہے۔ اور ان سے ماورا ہیں۔ انہوں نے ہمارے شعر و ثقافت کو آفاقی اساس بخشا ہے"[5]

غالب اور اقبال علاقائی حدود و قیود سے ماورا اپنے اپنے مقاصد میں سرشار نظر آتے ہیں۔ دونوں انسانیت کے علمبردار تھے۔ انسانیت کے لیے خطرناک ترین چیز محکومی ہے۔ کیونکہ جو قوم مغلوب ہو جاتی ہے۔ اس کی نفسیات ہی بدل جاتی ہے۔ دونوں ہی قوموں کی آزادی، انسانوں کی آزادی اور انسانیت کی آزادی کے طلب گار رہتے تھے۔ پروفیسر عبدالحق نے تو اس حوالہ سے اقبال کو غالب کے ذہنی افق سے بھی کہیں آگے محسوس کیا ہے۔ اقبال نے غالب سے کم رتبہ رکھنے والے فن کاروں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہ اقبال کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ اقبال کے مطالعہ کتب پر اگر توجہ دیں اور اس کے مضامین کے کتابیات پر غور کریں تو بہت سے منابع اور مصادر ایسے ملیں گے جن کے ساتھ فکر اقبال کی موافقت آفرینی نظر آئے گی۔ اقبال کے کلام میں ایسے شعرا سے بھی عجز و نیاز کا اظہار ملتا ہے جو غالب سے کم رتبہ ہیں۔ ان میں مرزا خان داغ ہیں، امیر مینائی ہیں۔ اقبال کے لیے صنم خانہ امیر بھی عجب چیز تھا۔ اقبال اس کے اتنے معتقد ہوئے کہ اس کے سامنے ہی سرِ تسلیم خم کر لیا۔ یہ عقیدت اور تسلیم و رضا کا انداز ہے جو اقبال نے اختیار کیا ہے۔ فکرِ اقبال کا مطالعہ انفرادیت کا حامل ہے۔ کوئی بھی اس مطالعہ میں اقبال کی شان کے برابر نہیں ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ غالب ہی ایسا فن کار ہے جو اقبال کی رہبری کر سکتا ہے۔ اقبال کے تصورات کی تکمیل کے لیے اور ان تصورات کے اظہار کی خاطر جو انداز اختیار کرنا تھا یہ تمام کمالات فن صرف غالب ہی اقبال کو فراہم کر سکتے تھے اور کلامِ غالب سے اقبال نے یہ استفادہ کیا بھی۔ غالب اور اقبال کو ایک نئی زبان، نیا آہنگ اور نیا شعری سانچہ ڈھالنا پڑا۔ اس طرح لفظوں کے معانی میں وسعت کے ساتھ سیلاب کی طرح بہنے کی کیفیت عام ہوگئی۔ اس طرح دونوں مفکر اپنے فکر کے فروغ میں کامیاب قرار پائے۔ یہ حادثہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ غالب اور اقبال دونوں ذوالسان شاعر ہیں اور دونوں حضرات ان زبانوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ غالب طرز بیدل کو پسند کرتے تھے اور اقبال بھی بیدل کو پسند کرتے تھے۔ بیدل کا ابہام تو اقبال کو بہت ہی پسند تھا۔ اقبال نے اس طرح آہستہ آہستہ اپنا علیحدہ مقام بنایا اور غالب سے آگے قدم اٹھایا۔ اقبال علی گڑھ

تحریک سے مولانا میر حسن کے توسط سے روشناس ہوئے اس لیے یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ فارسی زبان کے باعث مولانا میر حسن نے غالب شناسی کا شوق اقبال کے دل میں بھی پیدا کیا۔ تحقیدی اندازِ فکر ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ اقبال غالب کے ذہنی افق سے بھی کہیں آگے محسوس ہوتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں ہر رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی زمانے کی کوئی صورت ہو یا کوئی عنوان ہو، کہیں نہ کہیں اس کا اشارہ ضرور دکھائی دے گا۔ اس طرح غالب کے فکری وفنی پہلو کو اقبال نے ہمیشہ زندہ رکھا۔ داغ کے مرثیہ کے مطلع پر غور کیجیے۔

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں
مہدی مجروح ہے شہر خموشاں کا مکیں[6]

یہ روایت اقبال کے ہاں ہی نہیں ہے کہ دوسرے شعرا کی عظمت یا اپنے اشعار میں دوسرے کی بڑائی بیان کی جائے۔ دوسروں کے ہاں بھی کچھ ایسا ہی پایا جاتا ہے۔ غالب نے بھی کچھ بڑے شعرا کی حکمت اور دانائی کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی اور مرزا غالب سے اقبال کا تعلق ہر دور میں قائم و دائم رہا۔ یہ تعلق جسمانی نہیں بلکہ روحانی تھا۔ اقبال کے متروک کلام سے ایک نظم "فریاد امت" کا ایک شعر بطور حوالہ بھی دیا جاتا ہے جس سے اقبال کی غالب سے محبت کا برملا اظہار بھی ہوتا ہے۔

تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا[7]

اقبال نے تضمین کے طور پر غالب کا مصرع استعمال کیا ہے۔ اقبال کو مولانا میر حسن سے بھی نسبت تھی۔ غالب اور اقبال کے فلسفہ میں نمایاں پہلوؤں پر نظر ڈالیں تو دونوں کے تکرار اور تخیل میں اشتراکیت نظر آئے گی۔ دونوں کے فکر میں زندگی کا راز پالینے کا جذبہ عیاں ہو گا۔ اور پھر دونوں کے افکار میں ثقافتی پہلو کہیں اجڑتی ہوئی دلی اور کہیں ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ کی شکل میں دکھائی دے گا۔ یہ تو مشترک پہلو ہیں۔ مگر غالب کی عظمت کو چار چاند اقبال نے اس طرح لگائے جو آج تک کوئی نہ لگا سکا۔

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے[8]

ویمر وہ جگہ جہاں جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے دفن ہے۔

اقبال کی غالب شناسی میں ڈائری کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ Stray Reflection کا اردو ترجمہ پروفیسر عبدالحق نے "بکھرے خیالات" کے نام سے 1985 اور 2016 میں کیا۔ اقبال نے 1910 کے چند ماہ میں اپنے کچھ خیالات ڈائری کی شکل میں قلم بند کیے تھے۔ جو درج بالا ڈائری میں موجود ہیں۔ اس میں دو جگہ اقبال نے غالب کے حوالہ سے لکھا ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے ایک حوالہ انگریزی اور دوسرا حوالہ انگریزی کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی دیا ہے۔ دونوں میں اقبال نے غالب کی عظمت بیان کی ہے۔ یہ تحقیدی نتائج اقبال کی غالب شناسی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ "جاوید نامہ" اقبال کی زندہ و جاوید تصنیف ہے۔ اقبال اس میں بھی غالب کو نہیں بھولے۔ فلک مشتری ہے۔ وہاں اقبال کو غالب کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اقبال اور غالب میں مکالمہ ہوتا ہے۔ یہ ہے اقبال کی غالب شناسی کا انداز۔ اقبال نے اپنا فکر و فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ اقبال کی غالب شناسی کو مدنظر رکھ کر تفہیم غالب کو نئے انداز میں تخلیق کیا جانا چاہیے۔ تاکہ 1918 کی محاسن کلام غالب کے بعد کوئی جدید تخلیق سامنے آسکے۔

دنیائے ادب پر نگاہ دوڑائیں تو اقبال کے یہاں شعر اور فلسفہ کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ اقبال کو شاعرانہ حیثیت سے تو بہت بلند مقام میسر آیا مگر ماہر فلسفی کی حیثیت سے نہیں۔ اس تحقیدی پہلو پر اقبالیات کے حوالہ سے لکھا بھی بہت کم گیا ہے۔

کچھ ماہرین نے تو اسے مشکل بنا کر پیش کیا ہے۔ غالب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اقبال اور غالب کو سمجھنے کے لیے ان دونوں جیسا ذہنی مقام اور معیار درکار ہے اور جو ادبی ماہرین وہ مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں انھوں نے اقبالیات اور غالب شناسی کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ اقبال نے مشرق و مغرب کے دبستانوں کا مطالعہ کیا۔ مولانا جلال الدین رومی کے فکر و فلسفہ کو اپنے قلب و نظر میں ڈھالا۔ اور برصغیر میں رومی شناسی کو پروان چڑھایا۔ اس طرح بہت سے حکما اور ادبا سے اقبال نے استفادہ کیا مگر اقبال کے شعر و نغمہ کا اہم سرچشمہ غالب کا شعر و فن نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے اسالیب فن کا رشتہ غالب ہی کے شعر و فن سے جڑا ہوا ہے۔ اقبال اور غالب کے خیال اور فکر میں ایک خاص حد تک مماثلت نظر آتی ہے۔ ناقدین کا خیال کچھ اس طرح بھی سامنے آتا ہے:

> "غالب مفکر نہ تھے اور نہ فلسفیانہ ادب کے شناور، نہ ان کا کوئی انفرادی فلسفۂ حیات ہے۔ ہاں وہ ایک محدود سماج اور فضا ہیں دیدہ ور فنکار تھے۔ نظر میں بالیدگی اور گہرائی تھی۔ عام انسانوں کی ذہنی سطح سے اونچے، اشیاء کائنات پر سنجیدہ اور فکر انگیز نظر رکھتے تھے۔ ان کا دور اور سماج انحطاط سے دوچار تھا۔ اس دورِ انحطاط میں غالب جیسے عبقری کا وجود ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اور اسی ذہنِ رسا نے آنے والے دور کو متاثر کیا ہے۔ ہاں اگر وہ اقبال کے زمانے میں ہوتے تو شاید علم و فکر کے معیار اور منہاج پر پورا اترتے۔ اتنا تو تسلیم شدہ ہے کہ غالب پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہمارے شعر و ادب میں فکر و نظر کی گہرائی اور اس کے وسیع ممکنات کا جائزہ لیا۔ ہمیں انفس و آفاق کے مسائل پر گہری اور سنجیدہ نظر کی طرف متوجہ کیا"[9]

اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری کا مطالعہ کریں تو غالب سے اقبال کی ذہنی رغبت کے اشارے ملتے ہیں۔ انیسویں صدی کا آخری دور، بہت سے شعراء، علماء اور مفکرین کا ذکر، ساتھ ہی تضمین بھی نظر آتی ہے۔ غالب کے اشعار کی تعداد دیگر شعراء سے زیادہ ہے جن کے اشعار یا مصرعے بطور تضمین استعمال کیے ہیں۔ نعتیہ نظم "فریادِ امت" جو ایک طویل نظم ہے اور ڈاکٹر صابر کلوری نے متروک اردو کلام "کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال" میں شامل کی ہے۔ اس کے ایک شعر میں غالب کا مصرع بطور تضمین بھی استعمال کیا گیا ہے۔ 'بانگِ درا' میں جو نظم "مرزا غالب" شامل ہے پہلے یہ ستمبر 1901ء کے "مخزن" میں چھپی پھر اقبال نے اسے بدل کر بانگِ درا میں شامل کیا تھا۔ مولانا میر حسن نے اقبال کو غالب شناسی کی طرف راغب کرنے میں ترغیب دی ہوگی کیونکہ اقبال خود اس بات کے معترف تھے کہ انہیں اُس سید کے گھر سے یعنی مولوی میر حسن کے گھر سے علم و فضل کی دولت ملی۔ ان کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھنے والوں کا رتبہ بھی بلند ہوا ہے۔ مولانا خود بھی فکر و سخن کی پاکیزگی کے قائل تھے۔ غالب کو برصغیر میں فارسی شاعری کا آخری چراغ کہتے ہیں۔ اس لیے مولانا میر حسن نے بھی غالب کو نظر انداز نہ کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالب کے ساتھ اقبال کے ذہنی رشتے قائم ہوئے ہوں۔ یہ ذہنی رشتے اس وقت اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں جب دلی کا ذکر آئے۔ غالب نے دلی کو تباہ ہوتے دیکھا اور اقبال نے اس تباہی کو محسوس کیا۔ اس طرح جگہ جگہ اقبال اور غالب کے ذہنی رشتے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ داغ کا مرثیہ ہو تو ابتدا میں ذکر غالب کی عظمت کا کرتے ہیں اور پھر شاعری سے بات آگے بڑھے تو نثر تک پہنچے۔

اقبال کی بیاض "Stray Reflections" جس کا اردو ترجمہ پروفیسر عبدالحق نے "بکھرے خیالات" کے عنوان سے کیا ہے۔ اُس میں غالب کی عظمت کا اعتراف کچھ یوں کیا ہے۔

'میری نظروں میں، فارسی شاعر کی طرف سے عام مسلم ادبیات میں ہم ہندوستانی سیاست کا غالباً واحد

مستقل بنا سکتے ہیں"۔ فائز کرتا ہے۔ غالب کی عظمت کا اعتراف ہونا"۔[10]

غالب کی شخصیت میں صرف مغل تہذیب کا ہی نہیں بلکہ ہزار سالہ تہذیب کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ اقبال نے غالب سے بہت کچھ سیکھا۔ خاص طور پر یہ کہ:

"شاعری کے غیر ملکی تصورات کو جذب کرنے کے بعد بھی جذبہ و اظہار میں کیسے مشرقیت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے"[11]

غالب اور اقبال کے ذہنی رشتوں میں "جاوید نامہ" کو بھی بڑا دخل ہے۔ فلک مشتری پر اقبال کو "نوائے غالب" سنائی دیتی ہے۔ اس میں اقبال اور غالب کے ذہنی رشتوں کی دنیا استوار ہے جو تفکر و تدبر کا دریا بہتا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح فارسی اور اردو کے دونوں شعرا جو اپنی انفرادیت کے باعث خاص مقام رکھتے ہیں، ان کے متفرق پہلوؤں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے۔

سرسید احمد خان

اقبال کے فکر و فلسفہ پر ایک اور شخصیت کے نمایاں اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق نے اقبال کی ذات کو تمام فکرو فلسفہ کا مرکب قرار دیتے ہوئے اسے سرسید کے مشن کی تجدید اور توسیع قرار دیا۔ آج سید احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، سرسید احمد خان اور علامہ اقبال ہی کے اثر کا نتیجہ ہے جو ہمارا معاشرہ روشن ہے اور اس میں متحرک ہونے کی چمک دمک پائی جاتی ہے۔ سرسید احمد خان کا تعلق براہ راست ولی اللہی تحریک سے تھا۔ ہندوستانی معاشرہ برعظیم کے سلاطین و امرا کی خود غرضانہ کوتاہ بینی کے باعث جس تباہی سے دوچار ہو چکا تھا، ان حالات میں عوام کی اصلاح اور تربیت کا فریضہ انجام دینا ضروری تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ برصغیر عظیم کے مسلمانوں کی اخلاقی و سیاسی احیاء کا لائحہ عمل طے کیا اور ایک تحریک کی شکل دے کر آگے بڑھایا۔ پروفیسر عبدالحق کہتے ہیں:

"ولی اللہی تحریک کے زیر سایہ سرسید کی نشوونما ہوئی ان کی تربیت میں یہ تحریک ایک مرکزی مقام رکھتی ہے"[12] سرسید احمد خان نے شاہ ولی اللہ کی تحریک سے جو حاصل کیا وہ سبق سرسید کو اجتہاد کی حدود سے بھی آگے لے گیا اس طرح سرسید کے خیالات محض اصلاحی تحریک تک نہ رہے بلکہ انقلاب آفریں بن گئے۔ سرسید احمد خان کی کاوشوں میں پنجاب سے جن لوگوں نے ساتھ دیا ان میں مولانا سید میر حسن کو خراج تحسین پیش کیا جا سکتا ہے اور خوبصورت الفاظ میں ان کا تعارف اور سرسید سے ان کی دلچسپی کا ذکر ہماری نگارشات کو مزیّن کر سکتا ہے۔ مولوی میر حسن اقبال کے خاص اساتذہ میں ایک تھے اس طرح سرسید سے براسطہ مولوی میر حسن اقبال کو متاثر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ پھر سر راس مسعود کی محبت اور شفقت اور مہربانی بھی اقبال کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اپنے کلام میں اقبال نے سرسید کا مرثیہ کہا اور مسعود مرحوم کے لیے بھی مرثیہ خوانی کی۔ یہ عقیدت کے وہ پہلو ہیں جو اقبال کو سرسید سے تھی۔ اس عقیدت کا والہانہ اظہار کچھ ماہرین کی تصانیف میں نظر بھی آتا ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے سرسید کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور ان کے تعلیمی مقاصد کے بعد اقبال سے رشتہ جوڑتے ہوئے فرمایا۔

"سرسید نے تعلیم پر جو توجہ دی وہ اک بدیہی حقیقت ہے اقبال فکری تشکیل کے ابتدائی دور سے ہی اس کے نقیب نظر آتے ہیں"[13]

پروفیسر عبدالحق نے حوالہ کے طور پر نظم "فلاح قوم" کے حذف شدہ اشعار نظم "نالہ یتیم" سے چند اشعار اور مثنوی اسرار خودی سے کچھ اشعار پیش کیے ہیں۔ مغرب اپنی ثقافت اور معیشت کو وقت کے ساتھ ساتھ فروغ دینے میں کوشاں رہتا تھا۔ ترقی کا راز بھی یہ ہے۔ سرسید نے مغرب کا یہ راز پا لیا تھا۔ ہندوستان کے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ سرسید احمد خان مغربی ثقافت اور معیشت کے دلدادہ ہو چکے ہیں۔ حالانکہ سرسید چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ بھی مغرب کی طرح علم کے میدان میں آگے

بڑھیں۔ مگر یہ بات نہ اس وقت سمجھ میں آئی اور نہ ہی آج تک ہم سمجھ سکے۔ اس وقت سر سید کی مخالفت ہوئی اور پھر جب اقبال نے علمی ترقی کی بات کی تو لوگ ان کی مخالفت کرنے لگے کہ ایک طرف مغرب کی مخالفت اور دوسری طرف تعلیم میں مغربی ترقی۔ اقبال نے جہاں مغرب کی مخالفت کی ہے وہ مغربی ثقافت اور مغربی سیاست کے منفی پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ مگر ہم لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اسی لیے ماہرین کی یہ رائے قابلِ قدر ہے کہ:

"سر سید اور اقبال کی بخشی ہوئی امکانی وسعتوں کی تفہیم و توضیح کے لیے ہماری دانشوری ہنوز شرر سے شعلے تک رسائی کی محتاج ہے"[14]

سر سید سے اقبال کو اتنی رغبت تھی کہ جب 1936 میں "مثنوی پس چہ باید کرد" لکھ رہے تھے تو بیمار ہو گئے۔ اس دوران سر سید احمد خان خواب میں نمودار ہوئے اور بیماری کا علاج بتایا کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بیماری کا ذکر کرو۔ اس کے بعد "پس چہ باید کرد" کی آخری نظم کے باسٹھ اشعار اقبال نے کہے جو حب رسولؐ سے لبریز ہیں۔ اس نظم کے طفیل ہی آخری تصنیف "ارمغان حجاز" بھی مکمل ہوئی۔ سر سید احمد خان کا اقبال کے خواب میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال دل سے سر سید کے قدر دان تھے اور یہ عقیدت ابتدائی عمر سے ہی رکھتے تھے۔ عبد القوی دسنوی نے بھی اس عقیدت کا اظہار و اشگاف الفاظ میں کچھ یوں کیا ہے۔ اقبال کا تعلق علی گڑھ سے خاص طور سے مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے قائم ہوا تھا۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید کے نہ صرف دل سے قدر دان تھے بلکہ ان کے لیے ایک خاص عقیدت کا جذبہ ابتدائی عمر سے ہی رکھتے تھے۔ اس تعلق کی ابتدا غالباً اس وقت ہوئی جب مولانا میر حسن نے کہا: سر سید فوت ہو گئے ہیں۔ ذرا تاریخ وفات کی فکر کرنا"[15] یہ مضحکہ خیز تعارف۔ عبد القوی دسنوی نے اقبال کے سر سید سے عقیدت کے ساتھ بھی پھول نچھاور نشان۔ لیکن تعلیم، عقل، مغرب اور فکر و فلسفہ کے مشکل مسائل میں بہتر ہی پروفیسر عبد الحق نے کہا کہ وہ نظر نہیں آتے۔ پروفیسر عبد القوی دسنوی نے اپنے مضمون کے سر سید احمد خان اور ان کے ایک جذباتی اقبال نے سید کی مدح سرائی تو کی ہے لیکن ان کے ماننے والے کا اقبال نے بھی اظہار خیال کیا۔ اقبال نے بہت سی خوبصورت نظمیں قلم بند کیں۔ ان نظموں میں زیادہ تر ان شخصیت کا تعارف اور خوبیاں بیان کیں۔ لیکن سر سید کے حوالے سے جو نظم لکھا ہے اس میں سر سید احمد خان کی طرف سے خوبصورت نصیحتیں بیان کی گئیں۔ پروفیسر عبد القوی دسنوی اقبال کا نظم "سید کی لوح تربت" کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ اس طرح زندگی کے کئی مراحل ایسے نظر سے گزریں گے جہاں اقبال سر سید احمد خان کے ہم خیال نظر آئیں گے۔ عالم دین کو ترک دنیا کی تبلیغ سے گریز کرنا چاہیے۔ سیاست دان کو وقت کا غلام بن کر مصلحت کا پیغام نہیں دینا چاہیے اور مدبر کو قوم کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کرنا چاہیے۔ یہ دونوں کا مشترک مقصد تھا۔ سر سید احمد خان کی تحریک میں ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ آپ نے لفظی قدامت پسندی اور اصناف ادب کے جمود کو بھی توڑ ڈالا اس طرح آپ کو شدید ادبی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر اقبال ہی ایسا آفتاب تھا جس کے شرر میں ایسی ضوپائی جاتی تھی کہ جو جدت پسندی کا قندیل روشن کر سکے اس طرح سر سید ہی اقبال کے لیے پیش رو کہے جا سکتے ہیں۔

سر سید کے اضافی منصوبے کا نام ہی اقبال ہے۔ سر سید کے افکار کو سیلِ رواں کی طرح آگے پروان چڑھانے کی جو صورت فکر اقبال میں نظر آتی ہے وہ کسی دوسرے مفکر کے ہاں نظر نہیں آتی۔ اقبال کو بہت کم سر سید کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے۔ سر سید احمد خاں کے افکار و نظر نے اقبال کے فکر و خیال کو کشادگی اور وسعت عطا کی تھی۔ غالب کی روح کا اقبال میں حلول کر آنا جیسے جملے یا پھر حالی نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے جیسے تعریفی جملے لگتے تو بہت اچھے ہیں مگر تحقید کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اس کے لیے دلائل درکار ہیں۔ اقبال نے سر سید کے مشن کو آگے بڑھایا۔ جدید اسلام کی تشکیل میں ہندوستان میں

سر سید کے ساتھ اقبال اور ابو الکلام آزاد کا نام نمایاں طور پر سننے کو آتا ہے۔ اور بھی کئی نام ہیں جن میں مستند علماء کرام کے نام ہیں مگر سر سید کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اقبال نے باقاعدہ کردار ادا کیا ہے۔ سر سید نے جو اجتہادی انداز اختیار کیا اس کی تعریف بھی ہوئی مگر اسے تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ کم و بیش یہی کچھ اقبال کے ساتھ بھی ہوا۔ اقبال نے اسلام کی جدید تشکیل کے لیے جو جدوجہد کی اس کے لیے اگر سر سید احمد خاں ہوتے تو قدر کی نگاہ سے ضرور دیکھتے مگر اس دور کے علما کی طرف سے بھی کوئی خاص قدر و منزلت کی نگاہ سے اسلام کی تشکیل جدید کو نہیں دیکھا گیا۔ سید میر حسن کا سر سید سے دلی تعلق تھا۔ آپ سر سید کی پالیسیوں سے مکمل طور پر راضی تھے اور سر سید کی تحریک کے لیے مثبت کردار ادا کرنے اور خدمات ادا کرنے کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔ سر سید کو جب نقصان کا سامنا کرنا پڑا تو سید میر حسن نے خاص کردار ادا کیا جو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ سر سید احمد خاں جب کبھی پنجاب تشریف لاتے تو سید میر حسن ان کا استقبال کرتے تھے اور خدمت کرتے تھے۔ سر سید کے لیے جلسوں کا اہتمام بھی میر حسن ہی کرتے تھے اور سر سید کی تحریک کا تعارف بھی کھلے الفاظ سے کرواتے تھے۔ اس طرح مولوی میر حسن نے سر سید کا تعارف بھی اپنے افکار اور اپنی تعلیمات اور اپنی گفتگو کے زیر اثر اقبال سے کرایا۔ اقبال کا رویہ عقلیت کے حق میں نہ تھا۔ انہوں نے اس کے فائدے سے انکار بھی نہیں کیا وہ اس کی ضرورت اور اہمیت کا اعتراف کرتے تھے۔ اقبال کو کسی بھی طرح عقل دشمن نہیں کہا جا سکتا۔ مزید یہ کہ ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے دل میں سر سید سے محبت مولوی میر حسن نے ڈالی یہ بات تو درست ہے مگر یہ بھی یاد رہے کہ شیخ عبد القادر بھی سر سید سے خاص تعلق خاطر رکھتے تھے۔ سر سید احمد خان کو برا بھلا بھی کہا گیا۔ انہیں سخت کلمات سے نوازا گیا۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سر سید کے افکار پر غور و فکر بھی کرتے تھے اور ان نہیں درست بھی سمجھتے تھے۔ وہ لوگ جو فکر و نظر کے حامل تھے وہ چاہتے تھے کہ لوگ بلا وجہ سر سید کو برا بھلا نہ کہیں۔ شیخ عبد القادر کی محفلوں میں بیٹھنے سے اقبال کو ترغیب ملی اور وہ فکر سر سید سے قریب ہوئے۔ اب یہ اقبال شناس مفکرین کی ذمہ داری ہے کہ انتہائی مدبرانہ انداز سے سر سید احمد خان کی شخصی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریک کے نمایاں پہلوؤں کو بھی اجاگر کریں اور ساتھ ہی ولی اللہی تحریک سے سر سید کی وابستگی کا ذکر بھی ضرور کریں۔ پھر اقبال کے بارے میں یہ بتانا بھی لازم ہے کہ وہ کس طرح سر سید کی فکر سے متاثر ہوئے اور اسے کس طرح پروان چڑھانے کے لیے کوشاں رہے۔ واقعی سر سید احمد خان اقبال کے لیے اہم ترین مصدر کا درجہ رکھتے تھے اور فکرِ اقبال در حقیقت سر سید کے مشن کی توسیع ہے۔

خلاصۂ بحث

کلامِ اقبال جامِ جہاں نما سے کم نہیں ہے۔ اس میں حرف و صوت کے ہزاروں پیکر آویزاں ہیں۔ ان کا مطالعہ قاری کو فہم و فراست کی اس دنیا میں لے جاتا ہے جہاں ادراک کی حدود وسعت اختیار کر لیتی ہیں۔ دانائے راز کے جہان فکر و فن میں پیکر تراشی کی بہت سی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر شخصی صورتوں کا ذکر کریں تو مرزا بیدل، غالب اور سر سید کے پیکر آویزاں ہوں گے۔ مرزا بیدل کے شعوری اور فکر و تعمل سے معمور نکات نے اقبال کے ذہن کو متاثر کیا۔ غالب کے قرب کی قندیل سے اقبال نے اپنی گزر گاہِ خیال کو ہمیشہ فروزاں رکھا۔ فکرِ سر سید نے اقبال کے افکار، نظریات اور مقاصد کی توسیع کے لیے اہم ترین مصدر کا کردار ادا کیا۔ ان شخصیات کے اثرات اقبال کی شخصیت پر بھی نمایاں ہیں اور فکرِ اقبال کی توسیع کے لیے اہم ترین ماخذ بھی ہیں۔ اس مضمون کا مطالعہ اقبالیات کے موضوعات میں توسیع فراہم کرے گا۔ اس کے مطالعہ سے تحقید کے لیے عنوانات میں کشادگی پیدا ہو گی۔ اقبالیات کے منہاج کو وسعت عطا کرنے کے لیے اس مضمون کے ماخذات بین الاقوامی تصانیف کے مطالعہ کی ترغیب پیدا کریں گے۔

حوالہ جات

[1] اقبال، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد اول، مرتب، سید مظفر حسین برنی، دہلی: اردو اکادمی، اشاعت پنجم، ص862
[2] اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، اسرار ورموز، تمہید، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص9
[3] عبد الحق، پروفیسر، اقبال اور اقبالیات، دہلی7: عبد الحق، سی14، چھتر مارگ، 2006، ص89
[4] عبد الحق، پروفیسر، اقبال اور اقبالیات، ص95
[5] عبد الحق، پروفیسر، اقبال اور اقبالیات، ص60
[6] اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت6، 2004، ص115
[7] اقبال، کلیاتِ باقیاتِ شعر اقبال، مرتبہ، ڈاکٹر صابر کلوروی، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2004، ص108
[8] اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، ص56
[9] عبد الحق، پروفیسر، فکرِ اقبال کی سرگذشت، جون پور یوپی: رحمان منزل، بلوہ گھاٹ، 1989ص64
[10] اقبال، بکھرے خیالات، مرتبہ، ڈاکٹر جاوید اقبال، مترجم، پروفیسر عبد الحق، نئی دہلی: اقبال اکادمی ہند، 2012، ص72
[11] اقبال، بکھرے خیالات، ص73
[12] عبد الحق، پروفیسر، اقبال اور اقبالیات، ص50
[13] عبد الحق، پروفیسر، اقبال اور اقبالیات، ص55
[14] عبد الحق، پروفیسر، اقبال اور اقبالیات، ص57
[15] عبد القوی دسنوی، اقبالیات کی تلاش، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، 1984، ص120